چونتیسواں سفر ۔ واپس پاکستان اور واپس امریکہ

ابھی ہم نے سان فرانسسکو میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ ہمیں خبر ملی کہ ہماری بڑی لڑکی کی شادی کراچی میں جولائی ۱۹۹۱ء کے لئے طے ہوگئی۔ خوشی میں ہم پھولے نہ سمائیں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، کراچی کا رختِ سفر باندھا۔ ابھی امریکہ کا اصیل ''گرین کارڈ'' ہمارے پاس نہیں آیا تھا کہ یہ سارا کام ٹیکساس میں ہوتا تھا اور وہاں کام زیادہ اور کارکن کم تھے۔ اس صورت میں امریکہ چھوڑ کر ملک کے باہر جانے پر کچھ کاغذی کارروائی کرنا ہوتی تھی۔ ہم ۱۲رمئی کو پاکستان روانہ ہوئے، اور اس صورتِ حال کے مطابق ہمارے لئے ضروری ہوگیا کہ ہم ۱۲راگست سے پہلے واپس امریکہ میں داخل ہو جائیں۔ یہ ساری باتیں سُن کر اور ان چھوٹی بڑی قانونی شقیں سمجھ کر اور ان سے گزر کر ہمیں اپنی ہندوستان سے ہجرت بھی یاد آئی جو ایک زیادہ مشکل ہجرت تھی۔ پاکستان کا یہ سفر کوئی زیادہ اہمیت والا ثابت نہ ہوسکا۔ گرمیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ جہاں سے گزرے نیچے سرسبز میدان نظر آئے۔ سان فرانسسکو سے نیویارک اور پھر وہاں سے یورپ، سب ہی ہرا بھرا تھا۔ پھر اسلامی ممالک شروع ہوئے، اور ایک دم جیسے دنیا کی زمین بدل گئی ہو۔ زمین کا رنگ سبز کے بجائے بھورا ہوگیا۔ ہر طرف ریگستانی اور چٹانی علاقے شروع ہوگئے۔ یہی دیکھتے ہوئے ۱۴رمئی کو ہم کراچی پہنچ گئے۔

بڑی بیٹی رعنا کی شادی پاکستان نیشنل شپنگ کے ایک انجینئر سے طے ہوئی تھی۔ یہ صاحب چیف انجینئر کا امتحان پاس کر کے اب نئے عہدہ پر فائز ہونے کو تیار تھے۔ صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ اس شادی کی تیاری میں سارا وقت نکل گیا۔ شادی ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے۔ ہمیں کچھ سکون ہوا۔ دعوتوں اور کھانوں

میں ایک اور مہینہ گزرا۔ پھر پی آئی اے سے نیویارک کے لئے ۱۲/اگست ۱۹۹۱ء کی نشست پکّی کروالی۔

ہم کراچی ایئرپورٹ پر وقت سے بہت پہلے پہنچ گئے تھے۔ اندر پہنچے تو دیکھا کہ قطار در قطار لوگ اپنے سامان کے ساتھ کھڑے تھے۔ کافی پریشانی کا سماں تھا۔ ہم نے معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ پی آئی اے کی پرواز اس دن نہیں جارہی تھی۔ ہم حیران ہو گئے۔ ہم پی آئی اے سے زیادہ خوش نہیں تھے، کوئی بھی نہیں ہو سکتا تھا، لیکن پرواز کا بالکل ہی منسوخ ہو جانا تو بہت عجیب بات لگی۔ پی آئی اے کے ملازمین نے بتایا کہ پی آئی اے کی دو پروازیں جو فرینکفرٹ سے واپس آنا تھیں وہ واپس نہیں آئی تھیں، لہذا کوئی جہاز ہی نہیں تھا جو ہمیں لے کر جاتا۔ یہ وجہ سُن کر ہم باہر آئے تو دیکھا کہ اب یہاں یورپین مسافروں کی قطاریں لگ گئی تھیں اور یہ اپنے ساز و سامان کے علاوہ کتوں کو بھی ساتھ لئے کھڑے تھے۔ مزید معلوم ہوا کہ پان امریکن ایئرویز بند ہونے والی تھی اور اس نے بھی اپنی فرینکفرٹ سے کراچی کی پرواز منسوخ کر دی تھی اور اس کے تمام مسافر بھی اب پی آئی اے سے جارہے تھے۔ ہماری پریشانی بڑھ گئی۔ ہمیں لازماً ۱۲ اگست کو امریکہ میں داخل ہونا تھا۔

پی آئی اے کے افسران کو اپنا مسئلہ بتایا تو انہوں نے نہایت بے پرواہی سے کہا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک اور افسر نے کمپیوٹر میں دیکھ کر کہا، ''ایک فلائٹ لاہور سے کراچی رکتی ہوئی جائیگی، آپ اس پر جا سکتی ہیں۔ آپ یہاں مڈوے ہاؤس ہوٹل میں ٹھہر جائیں ہم آپ کو بلالیں گے''۔ ہم نے کہا کہ ''ہم ہوٹل میں نہیں، اپنے گھر میں ٹھہریں گے۔ یہ ٹیلیفون نمبر ہے، آپ ہمیں یہاں فون کیجیئے گا''۔ صبح کے ۵/ بجنے لگے تھے۔ ہم تھک کر گھر واپس آ گئے۔ ہمارے ایک بھانجے جن کے والد پی آئی اے میں بوئنگ ۷۴۷ کے کپتان تھے، وہ بھی اسی پرواز سے اپنے مفت ٹکٹ پر ''چانس سیٹ'' پر جانے کے لئے آئے تھے۔ یہ ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ انہیں غالبًا ایسی مشکلات سے نمٹنے کا زیادہ تجربہ تھا۔ پی آئی اے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مسافروں کو پہلے بلاتی تھی۔

گھر پہنچے اور تھوڑی دیر آرام کیا۔ اتنے میں لاہور والی پرواز کا وقت ہوا اور کوئی فون نہیں آیا۔ گیارہ بجے ہم خود ہی ایئرپورٹ پہنچے تو معلوم ہوا کہ لاہور سے نیویارک جانے والی پرواز پر بھی ہمارے لئے جگہ نہیں تھی۔ اس پر ہمیں بہت غصہ آیا اور ہم نے اپنا سامان ہی پی آئی اے کے آفس میں رکھا اور وہیں بیٹھ گئے۔ ہم نے پی آئی اے کے ایک اوپری افسر سے کہا، ''اب یہاں اس وقت تک بیٹھے ہیں جب تک کہ آپ ہمیں کسی فلائٹ پر نہیں بٹھاتے''۔ ہم رات کے ۱۲/ بجے تک وہیں بیٹھے اور اس طرح ۱۳/اگست ہوگئی۔ غالبًا یہ

افسران ہمیں دیکھ کر تھک گئے تھے یا واقعی اس پرواز پر جگہ تھی، ہمیں پی آئی اے کے افسران نے ۱۳/۱۴اگست کی پرواز پر نیو یارک کا بورڈ نگ پاس خود ہی لا کر دے دیا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ پچھلے دن کی پرواز جو لاہور سے نیو یارک گئی تھی، اس پر ہماری نشست ہمارے بھانجے یا کسی اور پی آئی اے کے ملازم کے خاندانی افراد کو ملی۔ بہت سارے ملازمین اپنے مفت ٹکٹ پر چلے گئے اور ہم اور کئی دوسرے مسافر اپنے مخصوص نشستوں کے باوجود اس طرح پریشان ہوئے۔ اب فرینکفرٹ پر جہاز رکا تو معلوم ہوا کہ اس کے کئی ٹائر مرمّتِ معمول (scheduled maintenance) کی ضرورت کے تحت بدلے جانے تھے اور یہاں جہاز ڈھائی گھنٹے رکے گا۔ باہر لاؤنج میں آئے تو کئی ایسے لوگ ملے جو اس پرواز کی افراتفری میں اب جان پہچان والے بن چکے تھے۔ ان سے ہی بات چیت کرتے رہے۔ ہم اپنے بچوں اور خاندان کے اِدھر سے اُدھر ہوتے رہنے کی وجہ سے سفر کی صعوبتوں کے عادی ہو چکے تھے، لیکن اکثر لوگ بہت ناخوش تھے۔ غرض واپس جہاز میں آئے۔ یہاں سے ہماری ہمسفر اچھی ملیں اور سارے راستے باتیں کرتے ہوئے آئے۔

نیو یارک کا امیگریشن اور کسٹمز میں ہمیشہ کی طرح یہی لگتا تھا کہ ایک آپا دھاپی ہو رہی ہے۔ ہر کوئی بھاگا جا رہا تھا۔ تمام دنیا کے لوگ اور تمام دنیا کی بولیاں اور شکلیں ایک ہی طرح سے بھٹکتی پھر رہی تھیں، سوائے امریکیوں کے کہ ان کے لئے دخول کے انتظام کے لئے الگ کاؤنٹر تھے۔ ہم نے پی آئی اے کے ایک شخص کو پکڑا جو اسی کام کے لئے تعینات تھے اور ہمارے پسند کے کھانے کے علاوہ یہ پی آئی اے کا ایک اور فائدہ تھا۔ ہم نے انہیں اپنا احوال سنایا تو یہ صاحب ہمیں ایک خاص کاؤنٹر پر پہنچا کر خود دوسرے مسافروں کی مدد کرنے لگے۔ یہاں ہم کافی دیر کھڑے رہے تب باری آتی ہوئی نظر آئی تھی کہ برابر کی قطار میں کھڑے ہوئے ایک خاندان کی خاتون نے ہم کو بتایا کہ ہم غلط قطار میں کھڑے تھے، اور ہمیں ان کی والی قطار میں کھڑا ہونا چاہیئے تھا۔ ان سے ہماری پہلے بات چیت ہو چکی تھی اور یہ پہلی بار اپنے ہجرت کے داخلہ کے کاغذات کے ساتھ امریکہ آ رہی تھیں۔ ہم ایک لمحہ کے لئے چونکے لیکن پھر ہم نے ان سے کہا، ''نہیں بیٹی اس کاؤنٹر پر تو ہم پچھلے ٹرپ میں گزر چکے ہیں''۔ اتنے میں ہماری باری آئی اور ہم دخولی افسر کو اپنا پاسپورٹ دے کر اسے بتانے لگے کہ کس وجہ سے ایک دن کی دیر ہوئی تھی۔ اس افسر نے اس ایک دن کی دیر کو زیادہ اہمیت نہ دی اور ہمیں یہاں سے فراغت ہوئی۔ کسٹمز پر بھی سرسری سی دیکھ بھال ہوئی۔ ہم اب تک صرف دیر سے امریکہ میں داخلے کے بارے میں دعائیں مانگتے رہے تھے، اس کا شکر ادا کیا۔ جہاز اترے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے، اب

یہ فکر کہ باہر ہمیں لینے کے لئے آنے والے بھی ہوں گے یا نہیں۔ اب دعاؤں کا رُخ بدلا اور ہم دعا کرنے لگے کہ ہمارے داماد باہر سامنے ہی ملیں کیونکہ اب تھکن شروع ہو چکی تھی۔ باہر نکلے تو بالکل سامنے ہی یہ صاحب موجود تھے۔ دوبارہ خدا کا شکر ادا کیا اور سوچنے لگے کہ اب کیا دعا مانگیں کہ آج اللہ مہربان لگتا تھا۔

اگست کا مہینہ تھا اور اب رات کے ۸/ بجے یہاں بہت سردی ہو چکی تھی اور گہرا کہر چھایا ہوا تھا۔ ہمارے داماد حسن نے ہمیں بتایا کہ ہمارے ساتھ کے مسافروں میں اسی پرواز سے ان کی خالہ زاد بہن معہ شوہر اور بچی کے آئے تھے۔ بیوی اور شوہر دونوں ہی ایران میں ڈاکٹر تھے اور ان کا لاٹری ویزا میں نام آ گیا تھا۔ پہلے کی افراتفری میں ہم نے ان کو نہیں پہچانا تھا اور ویسے بھی ہم نے انہیں کافی عرصے سے دیکھا نہیں تھا۔ ہم سب ساتھ ہی ایک کار میں بیٹھ کر کوئنز کی طرف چلے۔ اب کہر اور بھی گہری ہو گئی تھی اور سڑکوں اور فری وے کے نشانات کہر میں پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ اسی وجہ سے حسن راستہ بھٹک کر فری وے کے غلط خروج (Exit) سے اُتر گئے۔ اس وقت ساری دکانیں اور بازار بند ہو چکے تھے۔ ایک گیس اسٹیشن پر رک کر راستہ کے بارے میں پوچھا تو اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ غرض خود ہی دیکھتے بھالتے چلے تو ایک درخت کی آڑ میں چھپا ہوا اپنی سڑک کا نشان نظر آ گیا۔ کچھ سکون ہوا۔ ہماری نظر میں امریکی فری وے کی ڈرائیونگ ایک سائنس نہیں بلکہ آرٹ ہے۔

گھر پہنچے تو سیما اپنے بیٹے جعفر کو لئے ہوئے انتظار کر رہی تھیں۔ ان دنوں انہوں نے ایم ایس کی دوسری ڈگری کے لئے نیویارک یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ پہلا سمسٹر ختم کر چکی تھیں اور اب ستمبر میں دوسرا سمسٹر شروع ہونے والا تھا۔ سیما کراچی یونیورسٹی سے مائکرو بائلوجی میں پہلے بھی ایم ایس سی کر چکی تھیں لیکن پاکستان کی یہ ڈگری امریکی بی ایس سی یا بی ایس کے برابر ہوتی ہے کیونکہ امریکہ میں بی ایس کرنے تک طالب علم کو اتنے ہی سال لگتے ہیں جتنے پاکستان میں ایم ایس سی کرنے میں لگتے ہیں۔ حسن جو پان امیریکن ایئرویز میں کام کرتے تھے اس وقت ایک نئی ملازمت تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ پان امیریکن ان دنوں بس کھسک رہی تھی اور یہی لگتا تھا کہ اب بند ہوئی اور تب بند ہوئی۔ ہم یہاں چند ہی دن رک کر پھر سان فرانسسکو روانہ ہو گئے جہاں ہمارے بڑے بیٹے نجم کی بیگم اور تینوں بچے پاکستان سے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہ سب السو برانتے میں شمس کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ شمس کی جولائی ۱۹۹۱ء میں شادی ہو چکی تھی۔ ادھر سیما بھی بیٹے جعفر کو لے کر ادھر آ گئیں۔

کافی عرصہ بعد خاندان کے اتنے لوگ جمع ہوئے تھے، ورنہ جب سے بچے بڑے ہوئے تھے ایک ساتھ مل کر چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ کوئی یونیورسٹی میں ہوتا تو کوئی ملازمت کے سلسلہ میں اسلام آباد یا کسی دوسرے ملک گیا ہوا ہوتا تھا۔ پھر جب بچے امریکہ آنے لگے تو ویزا کی ضرورت نے مزید مشکل کھڑی کر دی تھی۔ یہاں مرد حضرات کے لئے امریکہ کا ویزا ملنا نسبتاً آسان تھا مگر لڑکیاں رہ جاتی تھیں انتظار میں۔ کوئی رشتہ باہر کر دو تو کئی سال ویزا کے انتظار ہی میں گزر جاتے ہیں اور نمبر نہیں آتا۔ والدین اس بٹوارے سے پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی یہ رشتے مضبوط ہوتے ہیں تب ہی بستیاں بستے بستے گو وقت بہت لگتا ہے اور ہجرت کا اثر کئی نسلوں تک چلا جاتا ہے، لیکن بالآخر سب ایک جگہ اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ ہمارا خاندان خوش قسمت رہا کہ ہم اور ہمارے سارے بچے نسبتاً کم عمری ہی میں یہاں آباد ہو گئے، اور اب ہم سب جمع ہو کر لیک ٹاہو پر تفریح کے لئے ایسے جا رہے تھے کہ جیسے کراچی میں کبھی کلفٹن جاتے تھے۔

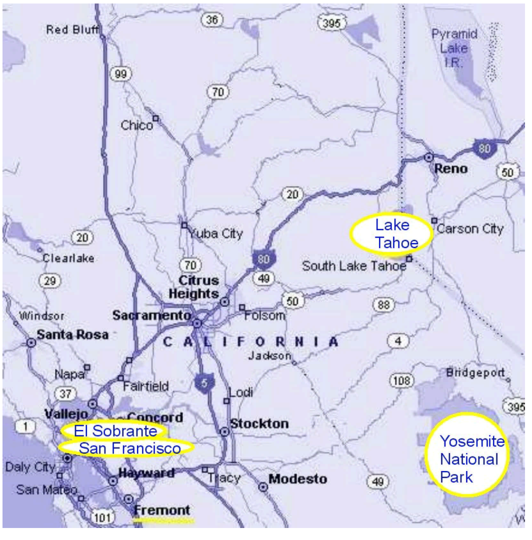

لیک ٹاہو اور سان فرانسسکو

السوبرانتے آنے کے چند ہی روز کے اندر ہم سب لیک ٹاہو دیکھنے گئے۔ ساتھ میں بڑی، منجھلی اور سب سے چھوٹی بہو، ہمارے دونوں بیٹے اور تین پوتے پوتیاں اور ہم تھے۔ ساتھ میں سیما اور جعفر بھی۔ دو کاروں میں سوار ہو کر یہ قافلہ السوبرانتے سے روانہ ہوا۔ چار گھنٹے کا راستہ تھا، اور وہاں دو دن رکنے کا ارادہ تھا۔ شروع میں تو راستہ عام فری وے کا تھا لیکن سیکرامنٹو شہر پار کرتے ہی راستہ پُر پیچ ہو گیا۔ دونوں طرف سبزہ

ہی سبزہ تھا اور ہر طرف اونچے اونچے پائن اور ریڈ ووڈ کے درخت نظر آتے تھے۔ ٹاہو شہر پہنچے تو سب سے پہلی نظر یہاں لیک ٹاہو پر پڑی جس کا پانی بہت صاف شفاف تھا اور آس پاس کے پہاڑوں کے درمیان ایک نگینہ لگتا تھا۔ ہم نے ایک ہوٹل میں چار کمرے لئے تھے جن سے ٹاہو جھیل نظر آتی تھی۔ یہ جھیل کہیں سیدھے ساحل اور کہیں بل کھاتے ہوئے کناروں کو لیتی ہوئی دور تک چلی گئی تھی۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے ہی بہت سی دُکانیں اور ریستوراں تھے۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ریاست نیواڈا کی سرحد تھی۔ یہ سرحد کیا ہے ایک پتلی سی سڑک ہے۔ اُن دنوں کیلیفورنیا میں جوئے خانے بنانے کی اجازت نہیں تھی لہذا سب جوئے خانے نیواڈا میں تھے، اور زیادہ تر کیلیفورنیا کے بارڈر پر تھے۔ اب سرحد کی اِس سڑک کے ایک طرف ہوٹل اور پارکنگ لاٹ اور سڑک کے دوسرے کنارے پر کاسینو کا دروازہ۔ ہم نے پورا دن شہر اور جھیل کے کنارے گزارا۔ رات ہوٹل میں رہے۔ دوسرے دن ناشتہ کر کے ہوٹل چھوڑا اور اطراف دیکھنے کا ارادہ کیا۔

لیک ٹاہو: ہائی وے ۵۰ کے راستے میں

اب ان بچوں کے ساتھ گئے تو ہر سماں، ہر پہاڑ اور سبزہ زار کو دیکھ کر الحمدللہ اور سبحان اللہ ضرور کہا، اس لئے کہ یہ اتنی بڑی بستی جس کو دنیا کہتے ہیں اُس کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ رنگ یہ نقش ونمود، یہ موسم اور طرح طرح کے پھول اور پھل۔ اور مختلف نسل اور زبان کے انسان، مگر سب خدا کے بندے ہیں۔ بچوں نے جھیل کے پاس جا کر مونگے وغیرہ جمع کئے اور پھر ہم جھیل کے اطراف کی سڑک پر کار میں بیٹھ کر ایک چکر لگانے گئے جو تقریباً دو گھنٹے سے بھی زیادہ کا تھا۔ راستہ میں پونڈیروسا رینچ (Ponderosa Ranch) دیکھا جہاں ٹی وی کا ایک پروگرام بونانزا (Bonanza) فلمایا جاتا تھا۔ غرض جدھر سے گزرے ایک نیا منظر تھا۔

سفر میں ہم عموماً خاموشی سے مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپنے اندر جذب کرتی ہوئی ان کیفیتوں

کو تحریر میں لانا بھی ایک ہنر ہوتا ہے۔ ہم تو صرف سیدھے سادے انداز سے رودادِ سفر اور واقعات سپردِ قلم کر رہے ہیں۔ وہ بھی کس کے لئے۔ یہاں امریکہ کے بچّے تو اردو جانتے ہی نہیں۔ جو بچّے پاکستان سے اردو سیکھ کر آئے بھی ہیں وہ بھی اردو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں کہ یہاں اردو کا سوائے اسلامک سنٹر، عیدین اور نمازوں کے علاوہ اور کہیں استعمال بھی نہیں۔ اب تو مسجد اور امام بارگاہ میں بھی انگریزی میں مجلس ہو جاتی ہے کہ وہاں بھی حاضرین میں ایرانی، عرب، اور بوزنیا تک کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی سوچ میں محو تھے کہ بیٹے نے کہا، ''چلیں، گھر چلتے ہیں''۔ اسی سڑک سے انہوں نے واپس السو برانتے کا راستہ نکالا اور گھر پہنچے۔

پاکستان سے ہمارے گھر میں کافی لوگ پہلی مرتبہ کیلیفورنیا آئے ہوئے تھے لہذا انہیں سب کو لاس انجلس لے کر جانا ضروری تھا کہ ڈزنی لینڈ اور یونیورسل اسٹوڈیوز جانا فرض ہے۔ پھر وہی لاس انجلس کے گرفتھ پارک اور کوئن میری میں جانے کا منصوبہ بنا۔ یہ ہم پہلے بھی دیکھ چکے تھے لہذا ہم اپنے عزیز کے گھر سمّی ویلی ہی میں ٹھہرے رہے اور باقی سب افراد یہ جگہیں دیکھ آئے۔ پھر ڈزنی لینڈ کا ہوا، تو یہ ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ اب ہم پہلی مرتبہ ڈزنی لینڈ گئے تو بہت لطف اٹھایا۔ بچوں کے لئے سارا انتظام تھا لیکن بڑے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ سارا دن مختلف سواریوں میں گزرا۔ اِن سواریوں پر وقت کم ملا اور اِن کے لئے قطاروں میں ہم کھڑے ہوئے زیادہ، اور کہیں تو بہت ہی زیادہ۔ بس سارا انتظام ایسا تھا کہ کم از کم آدھا گھنٹہ ایک قطار میں کھڑے ہوں اور پھر بمشکل تین منٹ سے پانچ منٹ کے رولر کوسٹر یا اسپیس فلائٹ پر گزاریں۔ اب جلدی تھکیں تو پھر ہر جگہ کھانے پینے کے لئے ریستوراں۔ پھر لاس انجلس کے ستمبر کی گرمی، لہذا ہر ایک کوک اور پیپسی پیئے جائے جس سے پیاس کا بجھنا کیا، پیاس بڑھتی ہی جائے کیونکہ اِس میں نمک بھی ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ وقت پائریٹس شپ پر ملا، لیکن اس پر ہجوم بھی کم تھا۔ ڈزنی لینڈ میں ان دنوں الیکٹرک لائٹ شو اور پریڈ ہوتی تھی جس کے لئے سب رات کے ۹ بجے تک رکے اور پریڈ میں مکی ماؤس اور منی ماؤس دیکھ کر واپس ہوئے۔ اگلے دن یونیورسل اسٹوڈیوز گئے جہاں طرح طرح کی نمائشیں تھیں۔ ان میں کاؤبوائے فلموں کی لڑائی سے لے کر ایک فلم ''ٹاورنگ انفرنو'' کے سیٹ پر بار بار آگ لگانے کا انتظام اور اسٹنٹ دیکھنے کو ملے۔ انہی ہنگاموں میں مصروف رہے اور اس طرح یہاں چار دن گزر گئے تو کار سے واپس السو برانتے آئے۔

پہلی مرتبہ یہاں بچّے آئے تھے تو ہمیں بھی ایسی جگہیں دیکھنے کو ملیں جو ان کے بغیر نہیں مل سکتی تھیں۔

انہیں سان فرانسسکو کی گلی گلی دکھائی۔ گولڈن گیٹ تو یہاں ہر آنے والے کے لئے دیکھنا لازم تھا، سو وہاں بھی گئے۔ اس کے بعد ایک دن ہم انہیں "مرین ورلڈ افریکا" لے کر گئے۔ یہ السو برانتے سے کوئی ۱۵ ر میل کے فاصلہ پر واقع ایک شہر ''ویلے ہو'' کے اطراف میں ایک بہت بڑا میوزیم اور تفریح گاہ ہے جہاں پانی کی سواریاں، پانی کے جانور اور پانی کے کھیل ہوتے ہیں۔ کچھ شیر چیتے اور ہاتھی وغیرہ بھی ہیں۔ ان دنوں یہاں ایک بڑے تالاب میں ایک وہیل مچھلی بھی تھی جو کم از کم ۲۰ ر فٹ لمبی ہے اور اس کا منہ کم از کم تین فٹ کھلتا تھا۔ یہ بہت سمجھدار مچھلی تھی اور اپنے تربیت دینے والوں کی سیٹیاں اور دوسری باتیں سمجھ کر مختلف کرتب ناظرین کے سامنے پیش کر رہی تھی۔ اس قسم کی مچھلی یہاں "اورکا" مچھلی کہلاتی ہے۔

سان فرنسسکو: ''ملا کی دوڑ مسجد تک'' ...... گولڈن گیٹ برج جو ہر آنے والے مہمان کو دکھانا لازم ہے

دوسرے دِن ہم سان فرانسسکو کے شمال مشرق میں واقع ناپا ویلی کے اس علاقہ سے گزرے جو اپنے انگور کی بیلوں کی وجہ سے مشہور ہے اور یہاں وائن کنٹری (wine country)، یعنی علاقۂ شراب کہلاتا ہے کہ انگوروں سے یہاں یہی بنتا ہے ورنہ کھانے کے لئے انگور زیادہ تر جنوبی امریکہ کے مما لک سے درآمد ہوتے ہیں۔ حرکتیں ہماری پسند کی نہ ہوں، لیکن علاقہ خوبصورت ہے اور سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک انگور کی بیلیں، لکڑی سے بنے ہوئے ڈھانچوں پر چڑھی ہوئی قطار در قطار چلی جاتی ہیں۔ اس علاقہ میں جگہ جگہ شراب کی ڈسٹلریز ہیں جہاں وائن ٹیسٹنگ روم (wine tasting room) بھی ہیں۔ ہر

آنے والے کو شراب کا ذائقہ بلا قیمت چکھایا جاتا ہے کہ لوگ انہیں پسند کریں اور خریدیں۔ ہم تو بس اِس جگہ کے حُسن کی تعریف کرتے ہوئے ریڈ ووڈ فارسٹ کی طرف چلے جہاں ۱۴۰۰؍سال پرانے درخت ہیں۔

وادیٔ ناپا (ناپا ویلی): یہ علاقہ انگوروں کی کاشتکاری کے لئے مشہور ہے۔ ہائی وے ۱۲ کے اطراف میں واقع ان دو باغات میں انگور کی بیلوں کی یہ قطاریں میلوں تک چلی گئی ہیں۔ دائیں تصویر میں دور وائن ٹیسٹنگ روم نظر آرہا ہے۔

دریائے سیکرامنٹو کو پار کر کے تقریباً تین میل دور، آرم اسٹرانگ نیشنل ریڈ ووڈ فارسٹ میں یہ درخت واقع ہے۔ یہ درخت بہت گھنے جنگل میں واقع ہے جہاں اس دن درختوں کے گھناؤ کی وجہ سے سورج کی روشنی کی صرف کرنیں بہت ہلکی ہو کر نیچے پہنچ رہی تھیں۔ بڑی دور تک بھول بھلیوں جیسی پتلی سڑکیں اور پگڈنڈیاں، بل کھاتی، گھومتی ہوئی چلی گئی ہیں۔ ہر موڑ پر لکڑی کے تختے پر پگڈنڈی کے نام اور نشانات بنے ہوئے ہیں، آنے جانے والوں کی سہولت کے لئے۔ یہاں ایک درخت ایسا ہے جس کی اونچائی ۳۰۰؍فٹ اور چوڑائی ۱۶؍فٹ ۶؍انچ لکھی ہوئی تھی۔ ان درختوں کی لکڑی اوپری چھال ہٹاؤ تو لال رنگ کی نظر آتی ہے جیسے کہ سرخی مائل بھورا رنگ کیا ہو۔ اسی لئے انہیں ریڈ ووڈ کے درخت، یعنی سرخ لکڑی کے درخت کہا جاتا ہے۔ یہ بھی قدرت کی صناعی میں آتی ہے اور یہاں سے ایک تنکا بھی جنگل سے باہر لے جانا منع ہے۔ ویسے بھی یہاں چوری چکاری عام طور

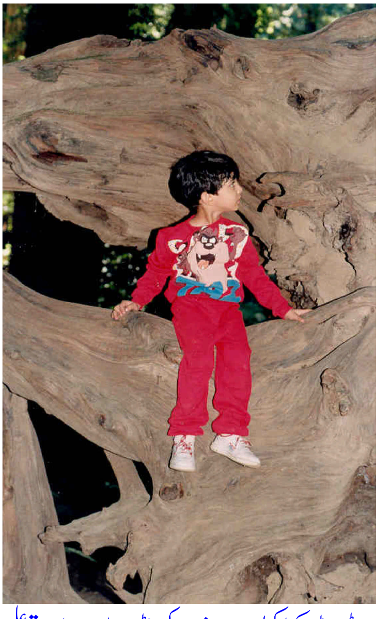

ریڈ ووڈ کے اکھڑے درخت کی جڑ پر ہمارے پوتے علی

پر نہیں ہوتی ،مگر جب ہوتی ہے تو ایسے اعلیٰ پیمانے کی کہ اس پر داستانیں اور فلمیں بنتی ہیں جو کراچی میں بھی لوگ جوق در جوق دیکھنے جاتے ہیں اور یہاں بھی ۔

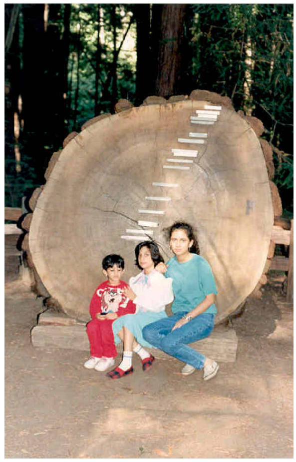

سان فرانسسکو کے شمال میں آرم اسٹرانگ نیشنل فارسٹ: دائیں طرف (۱۹۹۱ء) درخت کے کٹے تنے پر اس کی عمر کے نشانات۔ بائیں طرف (۱۹۹۲ء) ۱۴۰۰ رسالہ پرانا کرنل آرم اسٹرانگ درخت جس کی اونچائی ۳۰۸ رفٹ ہے۔

ان سب کو دوبارہ ہینگ گلائڈنگ دکھانے فورٹ فنسٹن لے کر گئے ۔ ساتھ ہی ایک آدھ گھنٹے کے لئے برکلے یونیورسٹی اور اسٹنفورڈ یونیورسٹی بھی لے گئے ۔ ان ہی باتوں اور سیاحیوں میں وقت جلدی سے گزر گیا اور ہماری بہو اور تین بچے کراچی واپس چلے گئے ، اور وہ بھی پان امیریکن ایئرویز سے ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پان امیریکن کی پرواز انہیں فرینکفرٹ کے ایئرپورٹ پر چھوڑ کر خود غائب ہوگئی اور انہیں بعد میں پی آئی اے سے کراچی جانا پڑا ۔ اس کے غالباً ایک ہفتے کے بعد ۱۹۹۱ء ہی میں ۶۳ سال کام کرنے کے بعد پان امیریکن ورلڈ ایئرویز بالکل بند ہوگئی ۔ ہمارے داماد حسن نے لاس انجلس میں لاک ہیڈ ایئرکرافٹ میں ملازمت اختیار کر لی لیکن ہماری بیٹی سیما نیو یارک ہی میں تعلیم کے سلسلہ میں رکی رہیں ۔ ادھر ۱۹۹۲ء شروع ہو کے ختم بھی ہونے لگا اور ہمارے بیٹے اعجاز کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی تو ان کا نام علینہ زہرہ رکھا گیا ۔ یہاں پر نام رکھتے ہوئے خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہ نام ہر ایک امریکی اور مسلمان صحیح طرح سے لکھ، پڑھ اور سمجھ سکے ۔ اب جیسے جیسے یہاں ہمارا خاندان بڑھتا رہا، ہمارا دل بھی زیادہ لگنے لگا ۔ ہم نے سان فرانسسکو کو مزید دیکھا ۔ قریب میں ایک جگہ واٹر ورلڈ میں ایک ڈولفن مچھلی کے تالاب میں منتظمین ان مچھلیوں کو غذا کے طور پر چھوٹی مچھلی

کھلاتے دیکھے اور ڈولفن اس غذا کو لینے کے لئے طرح طرح کے کرتب دکھاتیں۔ کبھی پانی سے ہوا میں چھلانگ لگاتیں اور کبھی بڑی سے گیند کو اچھال کر واٹر بال کھیلتیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کئی مرتبہ خلیج سان فرانسسکو میں ایک بڑی کشتی میں سوار ہو کر اس علاقہ کا جائزہ سان فرانسسکو بے سے بھی لے چکے تھے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے سمندری سفر کے لئے یہاں فیری چلتی ہے جو گولڈن گیٹ برج اور بے برج کے نیچے سے بھی گزرتے ہیں۔ اب جو یہاں آتا ہے، ہم اسے یہ پورا علاقہ دِکھا دِکھا کر اس سے بہت مانوس ہو گئے ہیں۔ دوسرا اس کی تعریف کرے تو ہمیں نمعلوم کیوں اچھا لگتا ہے۔

اب ہم یہاں چودہ سال سے ہیں، اور بچوں کو بیس بائیس سال ہو چلے ہیں، لیکن ابھی تک ہم نے اس ملک کو اچھی طرح نہیں دیکھا ہے۔ یہ دنیا اتنی چھوٹی نہیں اور پھر بقول علامہ اقبال،

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

جہاں یہ سفر چل رہے ہیں وہاں ہماری زندگی اب امریکہ میں جم رہی ہے۔ یہاں کی زندگی بھی عجیب ہے، لیکن اگر آپ اس کو سمجھ کر اس کے ساتھ کام کریں تو یہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ یہاں کا ذریعہ تعلیم آسان ہے۔ جیسے ہم پاکستان میں اردو کے ساتھ انگریزی سیکھتے ہیں، یہاں انگریزی کے ساتھ اسپینی یا فرانسیسی سیکھی جاتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک سے لوگ ہجرت کر کے یہاں آتے ہیں اور پھر سب انگریزی بولتے ہیں۔ ہم نے یہی دیکھا کہ جو اپنی تعلیم پاکستان میں مکمل کر کے یہاں اعلیٰ تعلیم کے لئے آیا، یا جو پاکستان سے پیسہ لے کر یہاں دُکان، گیس اسٹیشن اور موٹیل کھول بیٹھا، وہ نسبتاً زیادہ کامیاب رہا۔ اکثر وہ لوگ ناکام ہوئے ہیں جو کم پڑھے لکھے ہیں اور بغیر پیسے کے پاکستان سے یہاں آئے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ پاکستان میں بہتر تھے، یا یہاں بہتر ہیں۔ ایسے ہی لوگ اکثر غیر قانونی طور پر کام کرتے ہیں تو انہیں چھوٹے موٹے کام کرنا پڑتے ہیں اور خوف الگ رہتا ہے۔

ہم نے یہاں چرسیوں کو بھی دیکھا ہے اور دوسری نشہ آور برائیاں کرنے والوں کو بھی۔ سب غیر قانونی ہی ہے، لیکن سب کرتے بھی ہیں۔ قانون بھی عجیب ہیں کہ اگر نشہ کریں تو اتنا جرم نہیں، یا بالکل بھی نہیں، لیکن چرس اور کوکین آپ نہیں بیچ سکتے۔ لیکن شراب تو گروسری اسٹور تک میں مل جاتی ہے اور گیس اسٹیشن پر بھی۔ ہم تمبا کو کھاتے ہیں پان کے ساتھ۔ یہ تمبا کو ہندوستان سے آتا تھا لیکن اب اس پر پابندی ہو چکی ہے۔

ان چیزوں کے علاوہ ہر اس چیز پر جو کسی ڈبّے میں بند ہو، اس پر اس میں شامل چیزوں کے نام اور فیصد میں مقدار بھی لکھی ہوتی ہے۔ ہم ہر چیز کو پڑھ کر خریدتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بھی خاص کھانے کی چیزیں مل جاتی ہیں، اور دل کے مریضوں کے لئے بھی۔ غرض آسانیاں ہیں اور نقصان جب ہے کہ ہم خود برے بن جائیں۔

اگلے چار سال ہم یہاں رہے اور اردو کے تقریباً ہر مشاعرے میں شریک ہوئے۔ بڑا مصروف وقت گزرا۔ مشاعرے کے لئے برکلے یونیورسٹی اور کبھی کسی کمیونٹی سنٹر میں جگہ لے کر وہاں مشاعرہ کرتے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہاں پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے بڑے ریستوراں بن گئے تو یہ مشاعرہ وہاں ہونے لگے۔ ساتھ ہی ساتھ تمام دنیا سے مہمان آتے اور ہمارے گھر ٹھہرتے۔ ہم اُنہیں اس علاقے کو دکھانے نکلتے۔ ان سب مصروفیات کے باوجود ایک احساس رہتا ہے کہ اپنا پن کھو گیا ہے۔ اب آگے والی نسلیں، ہمارے پوتے اور پوتیاں ہوسکتا ہے کہ اس کو محسوس نہ کریں گی۔

اس دوران ہمارے آدھے بچے پاکستان میں تھے اور آدھے امریکہ میں۔ ہمارے دوسرے بیٹے شمس نے اپنی کمپنی قائم کر لی تھی۔ جولائی ۱۹۹۳ء میں ہمارے سب سے بڑے صاحبزادے نجم بھی امریکہ میں آئے اپنے بھائیوں سے ملنے، اور پھر وہی گھومنے پھرنے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا، کسی طوطے کے رٹے سبق کی طرح۔ اچھی طرح سان فرانسسکو کی سیاحت کی اور پھر اس کے نواح کی بھی ساری چیزیں دیکھنے کے بعد ہم اعجاز کی وین میں لاس انجلس کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں بھی وہی پرانی چیزیں دوبارہ دیکھیں۔ وہی کوئن میری اور وہی گرفتھ پارک، اور وہی فضائی آلودگی کہ شہر کبھی دور سے نظر ہی نہیں آتا۔ یہاں کا ایک مزاحیہ خیال یہ تھا کہ لاس انجلس کی اسکائی لائن ایک راز ہے کیونکہ یہ فضائی آلودگی سے چھپی رہتی ہے۔

اس مرتبہ ہم جب ہالی ووڈ گئے تو بہت ساری چیزیں نئی اور مختلف انداز کی دیکھیں۔ ہالی ووڈ کے رہائشی علاقوں کے نہایت عالیشان گھر دیکھے، ایک ایک گھر ۵ر سے ۲۵ رملین ڈالر کا۔ گھر کے چاروں طرف عموماً اونچی دیواریں تھیں گو کہ لوہے کی جالی والے دروازوں سے اندر کے وسیع لان اور درخت نظر میں آتے۔ ہر گھر کے باہر وڈیو کیمرہ لگا ہوا، ویسے ہی جیسے کہ ہمارے سنجلے بیٹے قمر کے گھر کے باہر اب ہمیں بھی لگوانا پڑ گیا تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہر کونے پر ایک سیکیوریٹی کی یا پولیس کی کار نظر آتی، لیکن نہایت سلیقہ سے چھپی ہوئی تاکہ

رہنے والوں کی نظر میں اس کی وجہ سے گھٹن نہ ہو۔ یا پھر سستے اخباروں کے نمائندے اور فوٹو گرافر کہیں اِدھر اُدھر نظر آئے۔ کچھ فری لانسر بھی ہوتے ہیں۔ یہ بے چارے تمام دن اسی طرح کھڑے رہتے ہیں اور اگر کوئی ڈھنگ کی تصویر مل گئی یا کوئی ایسی بات معلوم ہوئی کہ کراچی کے ایک پرانے اخبار ''نئی روشنی'' کی طرح کے اِن اخباروں میں چھپنے کے قابل ہوئی تو ان اخباری نمائندوں کو کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ ہم نے بھی کار کی کھڑکی سے دیکھا کہ کہیں دلیپ کمار یا وحید مراد نظر آ جائیں لیکن وہ یہاں کہاں۔ امریکی اداکاروں کو تو ہم اب تک نہیں پہچانتے، سوائے آئرن سائڈ کو۔

ہالی ووڈ لینڈ

لاس انجلس کی فری وے ۴۰۵ سے ہالی ووڈ کا نشان نظر آتا ہے۔ ہالی ووڈ پہلے ہالی ووڈ لینڈ کہلاتا تھا۔ ایک زلزے میں تصویر میں نظر آنے والے اس نشان سے ''لینڈ'' کے حروف گر گئے تو لوگ بھی ہالی ووڈ لینڈ کو ہالی ووڈ کہنے لگے۔

یونیورسل اسٹوڈیو میں بہت نئی نمائشیں تھیں لیکن اِس طرح کی چیزیں دیکھ دیکھ کر ذہن ان سے اتنا متاثر نہیں ہوتا، اور جب ذہن متاثر ہی نہ ہو تو بہترین چیز بھی عام لگتی ہے۔ لیکن بچوں کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔ یہ لوگ "اسپیس ٹریول" نامی ایک رائڈ میں بیٹھے۔ باہر نکلے تو بچوں کے چہرے نہال تھے اور بڑوں کے چہرے پر سناٹا تھا۔ یہاں کرسیوں پر لوگوں کو بٹھاتے ہیں اور پھر ایک بہت بڑی اسکرین پر تھری ڈی، 3D، فلم چلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کرسیاں تصویر میں گزرنے والی چیزوں کے ساتھ ہلتی ہیں۔ یہاں مقصد صرف سامعین کو دہشت زدہ کرنا ہے جسے بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ مختلف اسٹوڈیوز میں شارک اور ایسی ہی دوسری فلموں کے

سین کو فلمانے کی ترکیبوں سے آگاہی ہوئی۔ یہاں تو ہم بھی گئے۔ پھر ہم سب ایک مصنوعی کاؤبوائے ویسٹرن ٹاؤن گئے جہاں ویسٹرن فلمیں بنتی تھیں۔ بس ہر طرف پیسوں کا استعمال اور سائنس کا کمال دیکھنے کو ملا۔ یہی خیال ہوا کہ جب یہ لوگ وہ کام جو حلال نہیں ہیں، ایسی تندہی سے کرتے ہیں تو وہ کام جنہیں یہ حلال سمجھتے ہیں، وہ کتنی اچھی طرح کرتے ہوں گے۔ ہم سب نے دو دن یہاں لگائے اور پھر واپس السوبرانتے پہنچے۔

لاس انجلس: یونیورسل اسٹوڈیو میں ہمارے نواسے جعفر اور مصنوعی ویسٹرن ٹاؤن۔ ہم نے ان سیڑھیوں سے پرہیز رکھا اور اوپر سے ہی اس تصویر کو کھینچنے کی ڈائرکشن دیتے رہے۔

وقت انہی مصروفیات میں گزرتا رہا اور نجم جب واپس پاکستان گئے تو ۱۹۹۴ء شروع ہونے لگا تھا۔ اسی اثناء میں خبر آئی کہ ہماری بڑی صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہوئی اور وہ آغا خان ہسپتال کراچی میں داخل ہوگئیں۔ ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال کے لئے ہم اور اعجاز دونوں پاکستان جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

نشاں وفا کا نہیں جانتے مگر پھر بھی
چلے ہیں قافلے کچھ منزلِ جہاں کی طرف
الٰہی خیر ہو بچھڑے نہ کارواں سے کوئی
دعائے دل ہے پہنچ جائیں یہ نشاں کی طرف

سلطانہ آدا، السوبرانتے ۱۹۹۲ء